وہاں بھی گذارے۔ خود بیروت کو مشرق وسطیٰ کا عروس البلاد کہا جاتا ہے۔ اور دراقعی یہ شہر اور اس سے متصل دُور تک پہاڑوں پر پھیلی ہوئی آبادیاں اپنی آب وتاب اور دَورِ حاضر کے لوازماتِ عیش وعشرت میں فرانس اور سوئٹزرلینڈ کا مقابلہ کرتی ہیں۔

یوں بھی قدرت نے ارضِ فلسطین کے ان خطوں کو جو آج چھوٹے چھوٹے متعدد ملکوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ اپنی بخششوں سے خوب خوب نوازا ہے۔ تمام علاقہ نہایت زرخیز، سرسبز وشاداب۔ پھلوں پھولوں سے لدا ہوا، اُونچے نیچے سبزہ پوش پہاڑوں، صاف شفاف پانی کے جھرنوں اور سرد آب وہوا کے لحاظ سے جنت ارضی کہا جاتا ہے۔ پورے علاقہ کی زبان، لب ولہجہ کے اختلاف کے ساتھ عربی ہے۔ اور بیشتر آبادی مسلمانوں کی، دوسرے نمبر پر عیسائیوں اور کچھ یہودیوں کی ہے۔ مگر اپنی قدیم تہذیب وتمدن کو چھوڑ کر سب ہی مغربی تمدن کو اپنا چکے ہیں۔

بیروت سے دمشق کا فاصلہ لگ بھگ ۷۰ کلومیٹر کا ہے۔ یہاں تک آنے کا اصل مقصد بھی لبنان سے زیادہ دمشق کی زیارت کرنا تھا۔ چنانچہ اسی دوران کار کے ذریعہ ہم لوگ دمشق بھی گئے۔ جو اُموی خلافت کا مرکز اور عرب تاریخ میں علم وتہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ آج بھی یہ ملک شام (سیریا) کا دار السلطنت ہے۔ اور اپنے قدرتی حسن وجمال باغات۔ اور مہکی ہوئی فضاؤں میں دنیا کے منتخب شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے رفیق قدیم الحاج مسعود احمد صدیقی صاحب جنھوں نے اپنی عمر عزیز بیشتر فورن سروس میں گذاری۔ برسوں سعودی عرب بھی رہے۔ یورپ کے مختلف ملکوں میں بھی وقت گذارا، ان دنوں سیریا کے ہندوستانی سفارت خانہ میں مدار المہام تھے۔ ٹیلی فون پر اُن کو پروگرام کی اطلاع کردی گئی تھی۔ اپنے ان جانے پہچانے مہمانوں کی آمد سے بہت خوش تھے۔ خود ساتھ رہ کر دمشق کی سیر کرائی۔ دوپہر کو اپنے بنگلہ پر لنچ کا اہتمام بھی کیا۔ اور بیروت تک واپسی کے لئے اپنی مرسی ڈیز کار بھی پیش کی۔

دمشق کے اسلامی آثار میں سب سے اہم جامع اُموی ہے۔ اس روز ظہر کی نماز ہم نے اسی بابرکت مسجد میں ادا کی جس کے ایک گوشہ میں تاریخ اسلام کا نامور مجاہد اور فتحمند غازی سلطان صلاح الدین ایوبی آسودۂ رحمت ہے۔ اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھی، اور اُن کے سرہانہ رکھا ہوا قرآن پاک کا وہ نسخہ بھی دیکھا جو سلطان مرحوم تلاوت کیا کرتے تھے۔ جامع اُموی کے ایک دروازہ میں ایک گول دائرہ کا چھوٹا سا مدفن ہے جس کے بارے میں عام طور پر بتایا جاتا ہے کہ یہاں سیدنا حسین رضہ کا سر دفن ہے جو کربلا میں شہادت کے بعد یزید ابن معاویہؓ کی ہدایت پر دمشق لایا گیا تھا۔ جامع اُموی سے متصل ہی دمشق کی مشہور مسقّف مارکیٹ سوق حمیدی ہے، یہاں شامی مصنوعات اور خاص طور پر شامی سلک کے کپڑے بکتے ہیں۔ اس مارکیٹ سے گذرتے ہوئے کچھ مختصر سی شوپنگ کر کے مشہور مفسر و فیلسوف اسلام فخرالدین رازی کی قبر پر گئے۔ فاتحہ پڑھ کر سیدھے الشیخ محی الدین ابن العربی کی درگاہ پہونچے جو شیخ موصوف سے منسوب مسجد جامع الشیخ کے ایک گوشہ میں واقع ہے اور دن رات زائرین کی آمد و رفت سے آباد رہتی ہے۔

یہاں کافی دیر تک قیام رہا مفتی صاحب خاص طور پر شیخ مرحوم کی تصنیفات اور علوم دینیہ میں ان کے بیش قیمت کنٹری بیوشن کا تذکرہ کرتے رہے مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے اپنے بزرگوں سے اس مزار پاک کی برکتوں کے متعلق یہ بھی سُنا ہے کہ شیخ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد دعا کی جائے تو منجانب اللہ قوت حافظہ کی نعمت عطا ہوتی ہے۔ دل بہت چاہتا تھا کہ اس بارونق اور پُرفضا علاقہ میں اور کچھ دن گذارنے کا موقعہ ملے لیکن سفر کے شب و روز میں پورا ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ اور اسی روز شب کی فلائٹ پر ہمیں دہلی واپس ہونا تھا۔ اس لئے پروگرام کو مختصر کر کے دمشق سے بیروت واپس ہوئے اور ۲۴ مئی کو علی الصباح دہلی پہونچ گئے۔

قسط ۲

فلسطین کی ممتاز شاعرہ: فدوی طوقان

حقانی القاسمی، نئی دہلی

وہ خود لکھتی ہیں! ...... وھکذا ظلت کتاباتی للشعر أسیرۃ الحالات العاطفیہ والنفسیہ التی تباعت فجاۃ - وتذھب فجاۃ ولم أعرف الاحساس الذی ألم بالواقع واقۃ لتصاق الوجدانی الملازم بالقضیۃ الجماعیۃ الا بعد حرب حزیران" [۷]

گوکہ ایک زمانے تک ظاہری طور پر سیاست سے دور رہیں مگر دل ودماغ میں عرب قوم کا مسئلہ ہمیشہ گونجتا رہا۔ اس کے بارے میں وہ اپنی ڈائری میں اس کی وضاحت یوں کرتی ہیں:

وہ (اجنبی دوست) مجھ سے کہنے لگا: "میرا خیال تھا کہ تم عرب ملکوں کے موجودہ حالات کے بارے میں ایک رواقی قسم کی بے نیازی (لامبالاۃ) میں مبتلا ہو۔" میں نے جواب دیا: "سیاست کے اس ہنگامے سے کنارہ کشی اور اس میں عدم شرکت کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ میں سیاسی حالات کے بارے میں بے حس ہوں۔"

---

[۷] فدوی طوقان: "مرائی فی الحیاۃ" مجلہ "الدوحہ" (مایو ۱۹۸۴ء)

[۸] ______،

میں اس لعنت کو، جو ہمارے سروں پر چھائی ہوئی ہے بسر نہیں کر رہی۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح، جن کی تعداد خاصی زیادہ ہے، یہ کوشش کرتی ہوں کہ اس عرب تجربے کی گہرائیوں میں اتر کر اپنے فن کے لئے کوئی بنیادیں ڈھونڈھ نکالوں، لیکن میں اس میں عاجز اور ناکام رہتی ہوں۔ دراصل ہم اپنے اردگرد کی حقیقت کے سامنے دم بخود ہیں۔ اور ایک دکھے ہوئے دل کی جلن کے ساتھ ہم اپنے آس پاس ہونے والے واقعات میں معانی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کرنہیں پاتے یہ "حقیقت" جسے ہم بسر کر رہے ہیں، اس کا حاصل دکھ اور ہلاکت کے سوا اور کچھ نہیں، اور ہمیں زندگی کے ہر ہر لمحے میں اس نامسعود "حقیقت" کے ساتھ نباہ کرنا پڑ رہا ہے۔ [۹]

اس لئے وداد سکاکینی کا یہ خیال صحیح ہے کہ اپنی خاندانی وجاہت اور سکون و مسرت کے باوجود وہ مینارۂ عاج (IVORY TOWER) میں مقید نہیں ہیں، بلکہ معاشرہ کے انقلابی تحریکوں کے دوش بدوش رہیں [۱۰] اور اپنے قومی شعروں سے لوگوں کے سوئے ہوئے جذبات میں بیداری کی لہر دوڑائی۔۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ ایک شاعر نہ تو خلا میں زندگی بسر کرسکتا ہے اور نہ ہی مینارۂ عاج میں۔ کیونکہ اس کی پیدائش بنیادی طور پر ایک سماجی مظہر (social phenomenon) ہے اور ہر شاعر پہلے آدمی بعد میں شاعر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں شاعری بذات خود علیحدگی پسندانہ شئی نہیں ہے بلکہ اس کا سماج اور معاشرے سے گہرا ارتباط ہے۔ شاعر کا بنیادی منصب سماجی اقدار و تصورات کو بدلتے ہوئے سماجی نظام سے مرتبط کرنا اور دونوں نظاموں میں مفاہمت ہم آہنگی اور موزوں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ فدوی طوقان نے بھی سماج کے ایک فرد کے ناطے عرب المیے کو اپنا کرب سمجھا اور اسے شاعری کا موضوع بنایا۔

---

۹ محمد کاظم، مضامین (لاہور، ۱۹۹۹ء) ص ۱۶۲

۱۰ وداد سکاکینی، انسا، شہیرات فی الشرق والغرب (القاہرہ: ۱۹۵۰) ص ۷۹

گو کہ کبھی نفسیاتی و وجودی کشمکش کی وجہ سے اس سے بے تعلق رہیں۔ مگر بنیادی طور پر وطن سے محبت اور رشتہ ہمیشہ برقرار رہا۔ فدوی کہتی ہیں: "میں نے آج فیروز کا ایک نیا گیت " القدس کی پرانی گلیوں میں! " سنا۔ فیروز کی آواز ہمیں یہ احساس دلاتی ہے کہ ہماری زندگی کو ثبات حاصل ہے، اور حالات ہمیں کیسے ہی تہس نہس کیوں نہ کر دیں اس زمین کے ساتھ ہمارا رشتہ ہمیشہ قائم رہے گا۔"[۱]

(۲)

فدوی طوقان عرب دنیا کی ان معدودے چند خواتین شاعرات میں سے سمجھی جاتی ہیں، جن کی شاعری کو خاص امتیاز حاصل رہا ہے۔ اور یہ خواتین کے ادبی حلقوں میں نسوانی احساسات کی ایسی نمائندہ شاعرہ جانی جاتی ہیں جو پردے سے نکل کر روشنی، آزادی اور ثقافت کی دنیا میں داخل ہوئی ہیں، جو یونانی شاعرہ سافو اور عرب شاعرہ خنساء کی صفات سے متصف ہیں۔ ان کے اب تک کے شعری مجموعوں میں وحدی مع الایام (۱۹۵۵ء) وجدتها (۱۹۵۷ء) اعطنا حبا (۱۹۶۰ء) امام الباب المغلق (۱۹۶۷ء) اور اللیل والفرسان (۱۹۶۹ء) قابل ذکر ہیں۔

فدوی ایک جدت پسند شاعرہ ہیں۔ اور یہ اس وقت مکمل طور پر جدیدیت پسند (Modernist) شاعرہ کہلائیں، جب " اعطنا حبا " اور " وجدتها " جیسے شعری مجموعے سامنے آئے۔ جس میں جدید عربی شاعری کے تمام فنی پہلو در آئے ہیں۔ پہلے مجموعے " وحدی مع الایام " میں انہوں نے عمومی انداز کے شعر کہے ہیں یعنی وحدت ابیات کا دار و مدار تفعیلہ کے بجائے بحر پر رکھا ہے جس میں ہر بیت کی

---

[۱] محمد کاظم، مضامین (لاہور ۱۳۹۹ھ) ص ۱۵۵۔

ایک علیحدہ کامل وحدت ہے، قصیدے کے دس ابیات کے دس مختلف معانی ہیں۔ اور ہر وحدت قائم بالذات ہے۔ اس مجموعے کے قصیدوں میں "وحدت کاملہ" نہیں پائی جاتی، یعنی ایک بیت یا دو ابیات کے حذف کر دینے کے باوجود قصیدے کی معنویت مطلقاً اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک قصیدے میں صرف ایک بیت یا دو تین ابیات رہ جائیں تب بھی وہ فدوی کے مطلوبہ مقصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں اس کے باوصف کہ ہر قصیدے کا عنوان ہوتا ہے، جو کہ نئی شاعری کی خصوصیت ہے۔ جبکہ قدیم شعروں میں متعین عنوانات کے تحت قصیدے نہیں لکھے جاتے تھے۔ ۱۲

مذکورہ دیوان کے بیشتر قصیدوں کی بنیاد قصیدے کی وحدت کے بجائے بیت کی وحدت پر ہے۔ جسکی وجہ سے زیادہ تر قصیدے جدید عربی شاعری کی اہم خصوصیات سے عاری و خالی ہیں۔ مثال کے طور پر "ازدحام فی الزیتون" میں کسی قسم کی فنی وحدت نہیں ملتی ہے۔ ہر بیت کے معنی مابعد والے بیت سے مختلف اور الگ ہیں۔ پہلے بیت میں وہ کہتی ہیں:

ھنا؟ ھنا فی ظل زیتونۃ ٭ تحطم الروح قیود الثری

یہ اپنے معنی کی تکمیل کے لئے اس بیت ثانی کا محتاج نہیں ہے۔

وتحلہ النفس الی غزلۃ ٭ یغنق فیھا الصمت لغوا ودی

"وجدتھا" میں فدوی نے بیشتر قصیدوں میں عمودی روایتی ہیئت سے انحراف کرتے ہوئے وحدت قصیدہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ ان میں مکمل فنی وحدت بھی

---

۱۲ شاکر النابلسی، فدوی تشتبک مع الشعر (جدہ، ۱۹۸۵) ص ۱۳

پائی جاتی ہے۔ اس طور پر کہ ایک حرف حذف کر دینے کی وجہ سے بھی قصیدے کی مکمل فنی وحدت ختم ہو جاتی ہے: "الندم" اس کی نمایاں مثال ہے [۱۳]

فنی وحدت کے ساتھ "ارتکاز" بھی جدید عربی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے، جس کا کلی دار ومدار اس کیفیت / کمیت پر ہے جو وجدانی پہلوؤں کیساتھ کشمکش میں ذات تک پہونچتی ہے۔ اور ارتکاز کا تجربہ دراصل وہ لفظ اجتماع ہے جس سے قصیدے تشکیل پاتے ہیں، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس متعلقہ نقطے میں جمع ہوں۔ جس سے فکری، ثقافتی، فنی، معاشرتی اور تہذیبی پہلوؤں کی شعائیں پھوٹتی ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو فدوی صرف ایک رومانی شاعرہ نظر آتی ہیں جو اپنے تجربات بہت سادگی سے بیان کرتی ہیں جس میں گہرائی نہیں ملتی، رومانوی سے مراد یہ ہیکہ ان کے بیشتر موضوعات محبت، فراق اور پشیمانی کے اردگرد گھومتے ہیں۔ اور یہ خصوصیات ایسی ہیں جو اعلیٰ سطح پر ارتکاز کے محتاج نہیں ہیں۔ گو کہ کچھ قصیدے اس طرح کے ضرور ہیں جن میں کامل توحید و تاکید پائی جاتی ہے: "وحدی مع الایام" میں سطحی فنی تجربات ہیں۔ اور زیادہ تر قصیدے فکری، ثقافتی پس منظر سے عاری ہیں۔ اس لئے یہ جدید عربی شاعری کی ایک اہم خصوصیت "ارتکاز" سے محروم ہیں [۱۴]

فدوی جزوی تصویروں پر اعتبار کرتی ہیں اور کون و وجود کی جامع تصاویر میں اسے شامل نہیں کرتیں اس لئے رومانوی انداز سے ایسی تصویر پیش کرتی ہیں۔

---

[۱۳] تفصیل کے لئے دیکھئے، شاکر النابلسی: "فدوی تشتبک" ص ۱۷

[۱۴] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۱۹۔

جس میں سادگی، درخشانی ہو اور جو گہرے انسانی مدلولات سے بوجھل نہ ہو۔

اس سے اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ فدوی کے پاس کوئی خاص انسانی مسئلہ نہیں ہے یا کوئی ایسا فلسفیانہ فکری یا اخلاقی مسئلہ نہیں ہے جو کہ تپش، ٹیس، ارتکاز اور کامل توجہ کا محتاج ہو جبکہ ان کے معاصر شاعروں میں سے صلاح عبدالصبور، عبدالمعطی حجازی، بدرشاکر السیاب، عبدالوہاب البیاتی، خلیل حادی، احمد سعید ادونیس کے یہاں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔ ان تمام شاعروں کے یہاں واقعیت، مثال فکر، ناستلجیائی (Nostalgiat) کیفیت فلسفہ انکار و بغاوت، اور اساطیر ملتے ہیں۔ اور فدوی کا دیوان صوفیانہ خیالات اور رومانوی تصویروں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے ؎۱۵

دوسرے دیوان (وجد تھا) میں انہوں نے صوفیانہ آستانے سے چلتی پھرتی دنیا کی طرف لوٹنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ اس تبدیلی میں بھی گہری توجہ شامل نہیں ہے، اس دیوان میں رومانوی افکار و خیالات کی کثرت ہے۔ یہاں تک کہ ان کا قصیدہ "وجدتھا" کو جسے توجہ وارتکاز کی وجہ سے سب سے عمدہ تصور کیا جاتا ہے، اگر وجودی مسئلے پر مشتمل کسی جدید عربی قصیدے کے مقابلے میں رکھا جائے تو اس میں بھی عدم ارتکاز کی صفت در آئے گی شاکر نابلسی کے خیال میں" فدوی طوقان کے مشقت کے تجربات میں توجہ اور گہرائی اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ بدرشاکر السیاب اور خلیل حادی کی طرح اپنے شعروں میں اسطوری عناصر کا استعمال نہیں کرتیں، یا حد سے بڑھی ہوئی رومانویت

---

۱۵ شاکر النابلسی: فدوی تشتبک مع الشعر (ص ۱۸-۲۰)

سے خود کو دور نہیں رکھتی ہیں۔ جیسا کہ صلاح عبد الصبور اور عبد المعطی حجازی نے کیا ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی یہی رومانویت ہی دراصل گہرائی اور فنی ارتکاز کے خلاف ہے[15]

فدوی ایک رجائیت پسند شاعرہ ہیں جو اپنی محبت کے راستے پر بہت دور تک چلتی ہیں۔ کیونکہ وہ اس مستقبل پر یقین رکھتی ہیں جو ماضی اور حال کی تلخیوں سے بہتر ہوگا۔ ان کے یہاں شعری فضا زندگی کے ماحول سے ماخوذ ہے اور دونوں کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اور یہی تعلق حیاتیاتی تجربے اور فنی تجربے کو ہم آہنگ آوازوں کے انضمام پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اس بات سے واقف ہیں کہ شعری ماحول میں کسی کلمہ کو عام کرنے کے لئے کیا کیا جائے، چنانچہ (بعد عشرین عاماً) میں جہاں کی نفسیاتی فضا سیاہ اور غمگین ہے۔ اور شاعرہ بیس سال بعد اس وقت کی تصویر کشی کر رہی ہے۔ جبکہ جوانی ڈھل چکی ہے زندگی کے بہار مرجھا چکے ہیں، تو شاعرہ نے وہی کیفیت پیدا کرنے کے لئے ایک زمانی پہلو اختیار کیا، جس میں ہر چیز الم ناک نظر آتی ہے۔ آسمان سیاہ اور مہیب بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ اور اس کے نیل گوں پن کو اس سیاہی نے ڈھانپ رکھا ہے اور یہ زمانی پہلو سردی ہے جس سے شاعرہ کی مراد غمگینی اور رنج والم ہے۔ اس سیاق و سباق میں دیکھا جائے تو فدوی کے اندر جدید شاعری کی تمام تر صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ اور انہوں نے بتدریج جدید عربی شاعری کے تمام فنی نقوش ظاہر کئے ہیں جو ان کے تین دواوین پر محیط ہیں۔ اور ان تینوں کے بعد وہ مکمل طور پر جدید شاعرہ کہلانے کی مستحق ہیں[16]

---

[15] شاکر النابلسی؛ فدوی تشتبک مع الشعر، ص ۲۱، ۲۳۔

[16] " " " ص ۲۸، ۳۲۔

(۳)

محبت فدوی کے نزدیک ایک عام انسانی مسئلہ ہے۔ اپنے تینوں دواوین میں انہوں نے محبت کے سلسلے کے مختلف تجربات بیان کئے ہیں۔۔۔ (وحدی مع الایام) میں وہ آغاز جوانی یا مراہقت کے دور کی محبت کے اولین نقوش کو واضح کرتی ہیں اور خود کو مشتعل جذبات اور مضطرب احساسات کا مجموعہ سمجھتی ہے۔ اس مرحلے میں ان کی پہلی خواہش کسی غمگسار اور رفیق کی تلاش تھی، جو انہیں تنہائی، گوشہ نشینی (lonelinious) اور اس عذاب سے نجات دلائے جوان کے وجود کو کھائے جارہا ہے۔ ہر قصیدے میں اپنی تنہائی کی شکایت خاموشی کے ساتھ کرتی ہیں۔ اور اپنے احوال واقعی کے اظہار کے لئے اس بچی کا مرثیہ پڑھتی ہیں جو بغیر کسی رفیق کے اس دنیا سے تنہا گزر گئی جسے یاد کرنے والا کوئی بھی نہیں:

الصمت والظل وافکارھا

رفاقھا والسرحة الحانیه

فاذا؟ تموتین؟ فواحسرتاه

علی عروس الروض بنت الربیع

تلاش کی اس منزل میں فدوی جوان دوشیزاؤں کی طرح کسی رفیق کی تلاش کو پہلا مسئلہ مانتی ہیں۔ اور اسے سب سے حسین خواہش قرار دیتی ہیں۔ اس مرحلہ میں جب فدوی ناکام ہوگئیں تو اپنی ذات کی طرف لوٹ گئیں، اور اس مسئلے کو بھولنے کی ہر ممکن تدبیر کرتی ہیں۔ اپنے وجود کو عالمی اور کائناتی پہلوؤں میں منضم کی کوشش کی تاکہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ ایک عورت ہیں، تنہا ہیں اور عذاب سہہ رہی ہیں۔ ایک ایسے مرد کی تلاش میں ہیں جو اس کی زندگی کو خوشگوار کردے چنانچہ غم اور ناکامی بھلانے کی خاطر فطرت کی آغوش میں پناہ لیتی ہیں۔"

(باقی صفحہ پر)

تبصرہ

نام کتاب : کتاب المعلم (دروس اللغۃ العربیۃ لغیر الناطقین بہا)

تالیف : الدکتور ف۔ عبد الرحیم۔

ناشر : اسلامک فاؤنڈیشن ٹرسٹ، مدراس ۱۲

قیمت : پہلا حصہ (۳۰) روپے، دوسرا حصہ (۳۶) روپے تیسرا حصہ (۵۰) روپے

صفحات : پہلا حصہ (۵۷) دوسرا حصہ (۱۳۱)، تیسرا حصہ (۹۰)

یہ کتاب مصنف کی کتاب "دروس اللغۃ العربیۃ" کیسے پڑھائی جائے، اس موضوع پر ہے۔ مصنف کا نام جنوبی ہند کے طریقہ پر وی عبدالرحیم تحریر ہے (وی) کس کا اختصار ہے واللہ اعلم، (V) کو عربی رسم الخط میں (ف) تحریر کیا گیا ہے، جو غالباً درست نہیں ہے، مزید یہ کہ اردو کے اخبار (دعوت، دہلی) ۱۹۔۱۰۔۱۹۹۵ء میں بھی مصنف کا نام "ف۔ عبدالرحیم" ہی آیا ہے۔

ہمارے یہاں (V) اور (W) میں کوئی فرق نہیں کرتے، دونوں کے لئے (و) ہی سے استعمال کرتے ہیں لیکن عربی میں (V) کو تین نقطے والی فا (ڤ) اور (W) کو (و) لکھتے ہیں، اس لئے کتاب میں عربی رسم الخط میں اصل نام کا پہلا حرف عربی حروف تہجی کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ ہمارے یہاں عام طور پر وَقار (بفتح الواو) کو غلط طور پر وِقار لکھنے کا رواج ہے جیسے بہت لوگ انگریزی میں (Vikar) لکھتے ہیں، چنانچہ

Vikaruddin نام کے ایک صاحب کے نام دعوت نامہ میں ایک عرب نے ان کا نام ڈیکارالدین لکھا کیونکہ کوئی بھی عرب اس اسپیلنگ کے ساتھ اس کو وقارالدین نہیں پڑھ سکتا۔

حقیقت میں تو ان ہدایات برائے معلم کا بہتر مطالعہ اس وقت ہو سکتا تھا جب اصل کتاب "دروس اللغۃ۔۔۔" بھی ساتھ میں ہوتی لیکن ایسا نہ ہو سکا، مجھے صرف مکتبۃ الشباب الاسلامیہ لکھنؤ کے شائع کردہ دروس اللغۃ۔۔۔ کے دو حصے پائے جس میں (۶+۶) = ۱۲ سبق ہیں جبکہ کتاب المعلم کے مطابق پہلے حصہ میں (۱-۲۳)، دوسرے میں (۱-۳۱) اور تیسرے میں (۱-۳۴) اسباق ہیں مکتبہ الشباب کا ایڈیشن چھپائی کے اعتبار سے خراب ہے جو مبتدیئن کے لئے مناسب نہیں، امید ہے کہ یہ کتاب مصنف کی تقسیم کے مطابق اسلامک فاؤنڈیشن مدراس سے چھپی ہوگی جس کا معیار طباعت "کتاب المعلم" سے کم نہ ہوگا۔

کتاب کے مصنف عرصۂ دراز سے درس و تدریس سے وابستہ ہیں مزید برآں ۱۹۶۹ء سے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں اپنے میدان میں کام کر رہے ہیں، اور فی الحال مرکز الترجمۃ العربیہ میں خدمات انجام دے رہے ہیں (کچھ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مذکورہ اخبار "دعوت")

تدریسی کتاب لکھنے والے کے کچھ نظریات ہوتے ہیں اور اسلوب و مقاصد جن کی وضاحت، اس مثل کے مطابق "أهل مكة أدرى بأشعابها" اہل مکہ اپنی وادیوں کے بارے میں زیادہ واقف کار ہوتے ہیں، خود مصنف ہی اچھی طرح سے کر سکتا ہے اس لئے یہ کتاب ان مدرسین کے لئے بہت مفید اور ضروری ہے جو اس کتاب کو پڑھا رہے ہیں۔ یہ کتاب حقیقت میں اچھی کوششوں میں ہے جو ہندوستانی علماء عربی